

بحث و نظر

مولانا فراہی کی تفسیر سورۃ فیل پر اعتراضات کا جائزہ

مولانا نسیم ظہیر اسلامی

”مولانا حمید الدین فراہی کی علمی قابلیت اور معرفت کتاب الہی کے متعلق دنیا نے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ اپنی فکری صلاحیت، اجتہادی بصیرت، اور قرآن کی معرفت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، مولانا کی بے پناہ قابلیت کا اندازہ ان کی ”قرآنی تصانیف“ اور ”اجزائے تفسیر“ سے لگایا جاسکتا ہے اور معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مرحوم کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے وہ ثنائیہ مبالغہ سے قطعاً پاک ہے۔“

مولانا حمید الدین فراہی کے اجزائے تفسیر میں ”تفسیر سورہ فیل“ بھی ہے، اس میں انھوں نے بڑے مدلل طور پر اس عام خیال کی تردید فرمائی ہے کہ ابرہہ کے لشکر کی بربادی سمندر کی جانب سے آئی ہوئی چڑیلوں کی سنگباری سے ہوئی تھی، اور قریش اور دوسرے اہل مکہ، ابرہہ اور اس کے لشکر جبار کے خوف کی وجہ سے دامن کوہ میں بھاگ کر چھپ گئے تھے، حضرت مولانا کی تحقیق کے مطابق قریش اہل مکہ اور اس وقت باہر سے زیارت کعبہ کے لیے آئے ہوئے حاجیوں نے ابرہہ کے لشکر کا نہایت جم کر مقابلہ کیا تھا اور ان کی شدید سنگباری اور خدا کی نصرت اور تائید سے ابرہہ کا یوں لشکر تتر بتر ہو گیا، اس میں شدید بھگدڑ مچ گئی اور یہ یہاں گرا وہ وہاں گرا، یہ یہاں مرا وہ وہاں مرا کا عالم تھا۔ مولانا فراہی کی اس تحقیق سے جو بڑے غور و فکر کا نتیجہ اور قطعی دلائل و شواہد پر مبنی ہے بعض اہل علم کو اتفاق نہیں ہے، انھیں لوگوں میں مولانا شبیر احمد صاحب ازہر میرٹھی بھی ہیں، موصوف نے

ماہنامہ ”جامعۃ الرشاد“ اعظم گڑھ کے اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں مولانا فراہی کے مذکورہ بالا خیالات پر بعض اعتراضات کیے ہیں، سطور ذیل میں انہیں اعتراضات کا جائزہ لیا جائے گا۔

پہلا اعتراض

مولانا شبیر احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”طیر“ سے مردار خور پرندے مراد سمجھنا محض بے دلیل بات ہے، بعض شعرائے عرب نے فخریہ اشعار میں یہ مضمون باندھا ہے کہ جنگ میں ہماری فتح مندی و فطرتیابی یقینی ہے، ہم جب اپنے بہادر شہسواروں کو لے کر دشمن کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو پہلے ساتھ گدھوں کی ٹولی بھی فضا میں سرگرم پرواز ہو جاتا کرتی ہے، کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہم دشمنوں کو قتل کر ڈالیں گے تو انہیں کھانے کے لیے لاشیں نصیب ہوں گی، مولانا فراہی نے اس شاعرانہ مبالغہ آرائی کو حقیقت واقعہ سمجھ لیا کہ فی الواقع کسی کو کوچ کرتا ہوا دیکھ کر گدھ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں، حالانکہ عرب و عجم میں، ملک ملک میں، لاکھوں جنگیں ہوتی ہیں، فوج کشیاں کی گئی ہیں، لیکن آج تک کسی چھوٹی بڑی فوج کو کوچ کرتی ہوئی دیکھ کر گدھ اس کے ساتھ نہیں ہوئے۔“

یہ اعتراض بہت مبہم ہے کہ ”طیر“ سے مردار خور پرندے مراد سمجھنا محض بے دلیل بات ہے۔ اس کا اگر مطلب یہ ہے کہ لفظ ”طیر“ مردار خور پرندوں کے معنی میں آتا ہی نہیں ہے تو یہ بجائے خود بے دلیل ہے، آخر اس سے مردار خور پرندے کیوں مراد نہیں ہو سکتے؟ لفظ ”طیر“ ”طاریطیر“ کا مصدر ہے، جس کے معنی ہوا میں دونوں بازو سے اڑنے کے ہیں، پھر اسی سے منقول ہو کر پرندوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا، عام اس سے کہ پرندہ چھوٹا ہو یا بڑا، علاوہ ازیں قرآن مجید اور کلام عرب دونوں میں یہ لفظ مردار خور پرندوں کے معنی میں صراحتہ استعمال ہوا ہے، قرآن مجید میں ہے۔

وَأَمَّا الْآخِرُ فَيُصَلَّبُ فَقَاكُلُ
الطَّيْرِ مِنْ رَأْسِهِ (یوسف ۲۶)

اور دوسرے کو سولی دی جائے گی اور اس کے سر کو پرندے کھائیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ

اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے

مِنَ السَّمَاءِ فَتُخَفَّفُ الطَّيْرُ
تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے
اس کی بوٹیاں نوچ لیں۔ (ج ۲۱)

ان دونوں آیتوں میں لفظ ”طیر“ مردار خور پرندوں کے معنی میں صراحتاً استعمال ہوا ہے، کلام عرب میں بھی اس کی بیشمار مثالیں موجود ہیں، پھر آیت میں ”طیر“ کی صفت ”ابابیل“ آئی ہے، جو گھوڑوں کی جماعت یا بڑی چڑیوں کے لیے بولا جاتا ہے، چنانچہ زہیر ابن ابی سلمیٰ کا شعر ہے

وبالفارس من ورقا وقد علوا فرسان صدق علی جرد ابابیل
اور ورقاء کے ان شہسواروں کے ساتھ جو اصل غول درغول گھوڑوں پر
سوار تھے، اور جن کی جماعت مسلم تھی۔
اعشی کا شعر ہے۔

طریق وجبار رداء اصولہ علیہ ابابیل من الطیر تنعب
ان تمام شواہد کی موجودگی میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ لفظ ”طیر“ گدھ یا دوسرے مردار خور پرندوں کے معنی میں نہیں آیا ہے یا اس معنی میں آتا ہی نہیں ہے، اگر مولانا محترم کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سیاق و سباق کے اعتبار سے ”طیر“ کو مردار خور پرندوں کے معنی میں لینا بے دلیل ہے تو اس کے جواب میں صرف یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ مولانا فراہیؒ نے اس کے متعلق عقلی و نقلی دلائل و شواہد کا انبار لگا دیا ہے مولانا میرٹھی صاحب نے انھیں یکسر نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ جب تک ان دلائل کی تردید نہ ہو مولانا کا اعتراض بے معنی ہوگا۔ یہاں مولانا فراہی کے دلائل کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔ البتہ سورہ فیل میں مذکور چڑیوں کے متعلق بعض ان روایتوں کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جن سے مولانا فراہیؒ کے خیال کی تصدیق ہوتی ہے اور جن پر انھوں نے اعتماد کیا ہے اور جنھیں مولانا میرٹھی صاحب بغیر دلیل رد کر رہے ہیں۔ ان چڑیوں کے بارے میں حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے۔

كانت طيور اخضر اخضر
من البحر لها رؤس كروؤس
یہ چڑیاں سیاہی اٹل خاکی رنگ کی تھیں
جو سمندر سے آئی تھیں اور ان کے سر
السیاح لہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے
لہا خراطیم كخراطيم الطير واكف
ان کے چڑیوں کی طرح کے سونڈ اور کتے
کاکھٹ الکلاب لہ
کے پنجوں کے مانند چنگل تھے

۱۔ یہ دونوں روایاتیں تفہیم ابن جریر ج ۲۰ ص ۲۹۵ میں ہیں یہ دوسری روایت متعدد طرق سے مروی ہے

حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے

طیر خضی، لہا ماقید صفر مختلف
یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں اور
زرد گوں چوچوں سے ان کا گوشت کھاتی تھیں۔
علیہ السلام

مولانا میرٹھی صاحب فرماتے ہیں کہ ”کسی جنگی ٹولے کو کوچ کرتا ہوا دیکھ کر مردار خور چڑیوں کا ان کی کامیابی کا یقین کر کے ان کے ساتھ ہولینا محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہے“ ممکن ہے کہ ”چڑیوں کا یقین کرنا کہ لشکر ضرور کامیاب اور فتح مند ہوگا“ شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو، لیکن کسی فوج کو کوچ کرتے ہوئے دیکھ کر گدھ وغیرہ مردار خور پرندوں کا اس کے ساتھ ہو جانا کوئی مستبعد نہیں ہے، آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی کھیت میں ہل یا ٹریکٹر سے جوتائی شروع ہوتی ہے تو چھوٹے چھوٹے پرندے ان کے پیچھے ہولیتے ہیں، اس لیے کہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ زمین جوتے جانے پر اس کے اندر سے کیڑے کوڑے نکلیں گے جو ان کی غذا بنیں گے، اسی طرح ہمارے یہاں دیہاتوں میں کسی گڈھے یا تالاب میں مچھلی کا شکار کرنے کے لیے جب لوگ جمع ہوتے ہیں تو ان کی بھیل بھاڑ اور شور و شغب کے ساتھ ہی اس تالاب کے ارد گرد، چیل کوہ اور گدھ وغیرہ مختلف چڑیاں منڈلانے لگتی ہیں، جب آج مچھلی کا شکار شروع ہونے سے پہلے محض اس کی تہید کا منظر دیکھ کر چڑیوں کا یہ حال ہوتا ہے تو پھر چودہ پندرہ سو سال پہلے جبکہ دنیا اتنی زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ نہیں تھی اور جنگ کے میدانوں میں لاشیں سڑتی لگتی رہتی تھیں۔ کسی جنگی لشکر کو کوچ کرتے ہوئے یا لڑائی ہوتے ہوئے دیکھ کر مردار خور پرندوں کا وہاں منڈلانا یا لشکر کے ساتھ ہو جانا کون سی مستبعد بات ہے؟

۲۔ ہے اس میں خرطوم کا لحاظ استعمال ہوا ہے جو شکاری چڑیوں کے لیے متعل ہے چنانچہ امراء القیس کا شعر ہے
كانها القوۃ طلوب کان خرطومها منشال (روادٹی جھپٹے والے پر عقاب کی طرح ہے، جس کی چوچ کرچے کے مانند ہے) (تفسیر سورہ فیل از مولانا فراہی ص ۶۶ طبع ۱۹۹۳ء) ۱۰۰
۱۰۱۔ جیسا کہ ایک حماسی شاعر کہتا ہے کہ توتکتا هناك من بطل تسقى عليها الریاء حی لملمہ
(ہم نے وہاں میلان میں بہت سے بہادروں کو اس حال میں چھوڑ دیا کہ ہوائیں ان کے بالوں کے جوڑوں پر خاک اڑاتی تھیں)
اس شعر کے بارے میں مولانا میرٹھی صاحب یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ صرف شاعرانہ مبالغہ آرائی ہے کیونکہ شاعر عجب ہے اور یہ جس جنگ کا واقعہ ہے اس میں قبیلہ حمر کو نو عبد مناف نے شکست فاش دی تھی اور بہت سوں کو قتل کیا تھا اسی جنگ کی تصویر کشی شاعر نے اپنے اشعار میں کی ہے چنانچہ مولانا مفتی اعجاز علی صاحب شرح حاسر میں لکھتے ہیں۔
=

دوسرا اعتراض

مولانا میرٹھی صاحب اپنے دوسرے اعتراض کے تحت لکھتے ہیں ”پہاڑ کے اوپر سے کسی گروہ پر سنگباری اس صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ وہ گروہ پہاڑ کے دامن میں ہو، اس صورت میں پہاڑ کے اوپر سے جو پتھر پھینکے یا لڑھکائے جائیں گے ان سے اس گروہ کو نقصان پہنچے گا، لیکن ابرہہ کی فوج کو وادی محسر میں تنہا ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے، جن لوگوں نے وادی محسر دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے داہنی طرف یا بائیں جانب کے پہاڑ اتنے نزدیک نہیں کہ ان کے اوپر سے پھینکے ہوئے پتھر ان لوگوں کو ہلاک یا زخمی کر دالیں جو وادی محسر میں ہوں، مولانا فراہیؒ نے اپنی آنکھوں سے وادی محسر دیکھی ہوتی تو ہرگز یہ تادیل نہ کرتے۔“

یہ تسلیم ہے کہ ابرہہ کی فوج کو وادی محسر میں تنہا ہی کا سامنا کرنا پڑا جو ایک لمبی چوڑی وادی ہے، اور بائیں جانب پہاڑ دوری واقع ہیں، اس لیے اس وادی میں ٹہرے ہوئے لشکر پر پہاڑ کے اوپر سے پتھر مارنا یا لڑھکانا بہت مشکل تھا، مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عربوں کے سامان جنگ میں ایسے ہتھیار نہیں تھے، جن سے دور دراز تک پتھر مارے جاسکتے ہوں؟ ہمارے خیال میں مولانا میرٹھی صاحب نے اس پہلو پر غور نہیں فرمایا ورنہ وہ ایسی بے وزن بات ہرگز نہ تحریر فرماتے، مخنقی، قذاف، قذافہ فلاحن اور گوچھن وغیرہ عربوں کے خاص ہتھیار تھے۔ جن کے ذریعہ وہ دور ہی سے ایسی شدید سنگ باری کرتے تھے کہ مقابل لشکر کو منٹوں میں تتر بتر ہو جانے پر مجبور کر دیتے تھے، جن کتابوں میں جاہلی عربوں کی لڑائیوں (ایام العرب) کا مفصل تذکرہ ہے ان میں ان ہتھیاروں کے استعمال کا بھی جگہ جگہ ذکر آیا ہے، لسان العرب میں بھی ہے کہ

= وفيه يقول شاعر من حمير و اسی جنگ کے بارے میں حمیر کا شاعر کہتا ہے اور جو کچھ اس
الصف فيمات قال ولذا عدت هذه نے کہا ہے بالکل صحیح کہلے اسی لیے اس کے ان اشعار
الابیات من المنصافات کو ”منصافات“ میں سے قرار دیا گیا ہے۔

لہ مثلاً ابو عبیدہ کی ”شرح النفاض“ اور میدانی کی ”جمع الاشغال“ وغیرہ۔

قیل اکاعرابی کیف کانت حروبکھ؟ کسی اعرابی سے پوچھا گیا کہ تمہاری جنگیں کیسی
فقال کانت بیننا حرب ہوتی تھیں تو اس نے کہا کہ ہمارے درمیان
عون، تفقاً فیہا العیون بڑی سخت جنگ ہوتی تھی، اس میں آنکھیں
فتارۃ نجیق واخری نرشق فتارۃ نجیق واخری نرشق
تھے تو کبھی تیر چلاتے تھے۔

جنگ احزاب کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی منہنق نصب کرنے کا
حکم فرمایا تھا، اور اس حکم کی تعمیل ہی نہیں کی گئی بلکہ اس سے کام بھی لیا گیا تھا۔
ابرہہ کا لشکر بہت بڑی تعداد میں تھا اور ہر طرح مسلح تھا، اس لیے ضروری تھا کہ اس سے
گوریلا جنگ کی جائے (جس کے عموماً عرب عادی تھے) پھر منہنق اور قذاف وغیرہ سے سنگباری
کرنے کے لیے یہ ضروری بھی ہوتا ہے کہ مقابلہ لشکر کچھ دوری پر ہو، اس لیے وادی محسر کے بیچ
میں ابرہہ کے لشکر کا پڑنا جنگی اعتبار سے عربوں کے حق میں تھا، نہ کہ ان کے خلاف، چنانچہ انھوں نے
دونوں طرف سے ان کو گھیر کر اپنی منہنقوں کے ذریعہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

تیسرا اعتراض

مولانا میرٹھی صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں:-
”تاریخ عالم میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ دامن کوہ سے گزرتے
ہوئے کسی لشکر کو فریق مقابل کے آدمیوں نے پہاڑ کے اوپر سے وزنی پتھر لٹھکا
لٹھکا کر سخت نقصان پہنچایا ہے، اور وزنی پتھر لٹھکا لٹھکا ہے ہی جاتے ہیں ہاتھوں
میں لے کر دوڑ نہیں پھینکے جاسکتے، پس اگر لشکر ابرہہ کی تباہی بھی اسی طرح ہوئی
ہوتی تو آیت میں لٹھکانے کا ذکر ہوتا۔ حالانکہ آیت میں ”رمی“ یعنی پھینکنے کا ذکر ہے۔“

۱۔ لسان العرب ج ۱۰ ص ۳۷۷ ج ۲ ن ق ۲
۲۔ عرب کی تاریخ و جغرافیہ پر مولانا فریجی کی بڑی گہری نظر تھی خصوصاً ان جنگوں کا انھیں بخوبی علم تھا جن کا کسی
حیثیت سے قرآن پاک سے تعلق تھا، مولانا کو بیت اللہ کی زیارت کا بھی شرف حاصل تھا اس لیے انھوں نے
بچشم خود ان تمام مقلات کا مشاہدہ فرمایا ہوگا، اس اعتراض میں ان پر وادی محسر نہ دیکھنے کا طنز سرسبز ناروا اور غیر ذمہ دارانہ ہے۔

اس کا جواب اس سے پہلے والے اعتراض میں گزر چکا ہے کہ عربوں کے سامان جنگ میں منجنيق، قذائف اور گولہ بول وغیرہ بھی تھے، جن سے وہ شدید سنگباری کرتے تھے، ان ہتھیاروں کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر اور پرے لڑھکائے نہیں جاتے تھے، بلکہ اوٹ سے چھپ کر یا سامنے ہی سے دشمنوں پر پتھر پھینکے جاتے تھے، منجنيق اور قذائف وغیرہ کے جنگی استعمال کا غالباً مولانا کو علم نہیں ہے یہاں ائمہ لغت کے بعض اقوال پیش کئے جاتے ہیں۔

منجنيق: آلة حربیہ ترمی بہا منجنيق ایک ایسی جنگی مشین ہے جس کے ذریعہ پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ القذائف

القذائف: الذی یرمی بہا الشیء قذائف ایک مشین ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز دور پھینکی جاتی ہے۔ فیبعد

صاحب لسان العرب نے یہ اشار نقل کیے ہیں

لما اتانی الشقی الفتان فنصبوا قذائفہ بل ثنتان^۱ جب ثقیف نوجوان ہمارے پاس آئے تو انھوں نے ایک نہیں بلکہ دو پتھر مارنے کی مشین نصب کی مزاد کا شعر ہے:

قد یفتہ شیطان رجیم رمی بہا فصارت ضواۃ فی لہاز مضمزم^۲

یہ وہ اوزار ہیں جن سے عرب پتھر مارا کرتے تھے، صرف ہاتھوں سے نہیں مارتے تھے، جیسا کہ مولانا میرٹھی صاحب کا خیال ہے، شمشیر زنی اور سنگباری ان کا روزانہ کام مولانا تھا۔ وہ ان سب کے بڑے ماہر تھے، پھر یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ انھوں نے نہتے ہو کر اس شکار کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا؟ بلاشبہ انھوں نے جبکہ وہ حالت احرام میں بغیر تیراقلوار کے تھے ان ہتھیاروں کو ضرور استعمال کیا ہوگا جو اس وقت ممکن الحصول تھے اور انھیں ہتھیاروں کے لیے جیسا کہ پہلے مثالوں سے ثابت ہو چکا ہے ”رمی“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اس لیے آیت میں لفظ ”رمی“ واقعہ اور اقتضائے حال کے عین مطابق ہے اس پر سرے سے کوئی اعتراض ہی وارد نہیں ہوتا، لڑھکانے کی بات تو محض مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی کی اتباع اور اختراع ہے، مولانا فراموش

نے اڑھکانے کی کوئی بات ہی نہیں لکھی ہے کہ اس پر کوئی اعتراض وارد ہو۔

چوتھا اعتراض

مولانا میرٹھی صاحب کا چوتھا اعتراض یہ ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی ہے کہ وہ پھینکے ہوئے پتھر ”سجیل“ کی جنس کے پتھر تھے، مولانا فراہی گو بتانا چاہئے تھا کہ اگر ابراہیم کی فوج پر اہل مکہ نے سنگ باری کی تھی تو سجیل کے سنگ زیرے کہاں سے لائے تھے، جبکہ مکہ و نواح مکہ بلکہ تمام حجاز کی سرزمین میں سجیل کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے۔“

مولانا میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض بھی بالکل بے سرو پا ہے کہ ”مکہ و نواح مکہ بلکہ تمام سرزمین حجاز میں سجیل کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے“ کیوں کہ انھوں نے اس بے بنیاد دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے، ایسے بے ثبوت دعویٰ کی موجودگی میں کون مان سکتا ہے کہ پوری سرزمین حجاز میں کنکر (سجیل) پائے ہی نہیں جاتے، کنکر ایک معمولی چیز ہے اس کا ہر جگہ ہونا ممکن ہے، جن لوگوں نے اس وادی کو دیکھا ہے اور جو لوگ مکہ اور حجاز میں رہ چکے ہیں ان سے دریافت کرنے پر یہی معلوم ہوا کہ وہاں کنکر پائے جاتے ہیں خصوصاً وادی محسر کا علاقہ تو کنکروں سے بھرا پڑا ہے۔

قرآن مجید میں دو جگہ اور لفظ ”سجیل“ آیا ہے۔

۱۔ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارًا مِنْ سِجِّيلٍ مَفْضُودٍ (ہود: ۸۲)

۲۔ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارًا مِنْ سِجِّيلٍ (حجر: ۷۳)

ایک دوسری جگہ سجیل کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارًا مِنْ طِينٍ (ذاریات: ۵۱)

ان آیتوں میں عرب بائدہ کا ذکر ہے جن کو ایسی شدید اور تباہ کن آندھی کے ذریعہ ہلاک کیا گیا تھا، جو اپنے ساتھ ”سجیل“ کے قسم کے پتھر لیے ہوئے آئی تھی اور مسلسل کئی روز تک چلتی رہی، یہ قومیں عرب تھیں اور سرزمین حجاز میں آباد تھیں، انھیں ہلاک کرنے والی آندھی کہیں دور دراز سے کنکر پتھر

لے کر نہیں آئی تھی، بلکہ وہ جن راستوں سے گذرتی تھی انھیں میں بڑے ہوئے کنکر پتھر اپنے ساتھ لٹا رہے ہوئے چلتی تھی، اب اگر اس علاقہ میں سجیل کے قسم کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے جیسا کہ مولانا میرٹھی صاحب کا دعویٰ ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آندھیاں بھی اپنے ساتھ ”سجیل“ کے پتھر کہاں سے لائی تھیں؟ مولانا ان آیات پر بھی ذرا بھر کر غور فرمائیے تو یہ عجیب و غریب اعتراض ہرگز نہ فرماتے، اگر بالفرض مولانا کی یہ بات تسلیم ہی کرنی جائے کہ سجیل کے پتھر حجاز میں پائے ہی نہیں جاتے تو یہ بات کس طرح مانی جاسکتی ہے کہ ”بحجراتہ من سجیل“ سے مراد وہی پتھر ہے جس کو ”جلا کر پیس کر عمارتی چونا بنایا جاتا ہے“؟ حالانکہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

قال ابن عباس، سجیل معناه
سنگ و کچھ، یعنی بعضہ حجر
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ
سجیل کا معنی سنگ اور گل ہے یعنی اس کا
و بعضہ طین ہے
کچھ حصہ پتھر اور کچھ مٹی ہے۔

کیا اس کے بعد بھی مولانا میرٹھی صاحب کو اپنے اخذ کردہ مفہوم پر اصرار ہوگا؟

پانچواں اعتراض

اب مولانا کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اعتراض ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:-

”سجیل“ کے قسم کے سنگریزے مار کر تین چار ہزار آدمی ساٹھ ہزار آہن پوش فوج کو کوئی خاص گزند نہیں پہنچا سکتے، سب کو ہلاک کر ڈالنے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دینے کا ذکر ہی کیا“

یہ اعتراض بڑا مضحکہ خیز ہے کیونکہ ”سجیل“ (سنگریزے) برسانے والے خواہ عرب ہوں یا چڑیاں، دونوں ہی صورتوں میں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی حفاظت کرنے اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے چڑیوں کے پھینکے ہوئے چنے اور دال کے برابر سنگریزوں میں اتنی قوت دے سکتا ہے کہ وہ گولیوں اور زمخوں کا کام کریں تو کیا وہی خدا اس

سہ مولانا میرٹھی صاحب نے اپنی تفسیر میں سجیل سے مراد اسی پتھر کو لیا ہے اور خطا کشیدہ جملہ انھیں کا ہے۔

سہ تفسیر رازی ص ۱۰۱ ج ۳۲

سہ تاریخ اور تفسیر کی تمام کتابوں میں ہے کہ چڑیوں کے پھینکے ہوئے پتھر حجازی دال کے برابر تھے۔

بات پر قادر نہیں ہے کہ جب اس کے چند ہزار کمرہ بندے کفن بردوش اس کے گھر کی حفاظت کے لیے ایک جہاد عظیم میں مصروف ہوں اور ان کا سردار (عبدال مطلب) خانہ کعبہ کے دروازہ پر کھڑا ہو کر اپنے خدا کے حضور یہ پردرد دعا کر رہا ہو:

اللهم ان المسر، يمنح رحله فامنع رجالك

اے اللہ آدمی اپنے اہل کی حفاظت کرتا ہے پس تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر

لا یغلبن صلیبهم ومحالهم ابد امحالک

ان کی صلیب اور قوت تیری قوت پر غالب نہ ہو

ان کنت تارکهم وقبلتنا فامر ما بدا لك

اگر تو ہمارے قبلہ کو ان کے زیر نگین کرنا چاہتا ہے تو وہی کرجو تیری مرضی ہو

یارب کا ارجو لهم سواک یارب فامنع عنهم صھاك

اے اللہ میں ان کے بارہ میں تیرے سوا کسی اور سے امید نہیں رکھتا، پس تو اپنے گھر کی ان حفاظت کرتو ان کے پھینکے ہوئے کنکروں اور پتھروں میں ایسی قوت نہ رکھ دے کہ ساتھ ہزار نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد پر مکمل فوج ان کی سنگ باری کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جائے؟ مزید براں جبکہ ان کی سنگ باری کے ساتھ تاثیرِ شبی کے طور پر آسمان سے بھی سنگ باری ہو رہی ہو؟

ہم اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے مولانا فرائی کی تفسیر سورہ فیل کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔
 ”اس کی سب سے پہلی مثال غزوہ بدر میں ملتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر کنکریاں لیں، اور قریش کی طرف رخ کر کے فرمایا ”شاهت الوجوه“
 ”خدایا یہ چہرے بگڑ جائیں“ اس کے بعد کنکریاں ان کی طرف پھینکیں اور صحابہ سے فرمایا ”بڑھو“ نتیجہ ہوا کہ تمام کفار کو آنکھوں کی پگٹی، اسی کی نسبت سورہ انفال میں فرمایا: - وما رمیت اذ رمیت ولكن الله رمى (۱۷) (جب تم نے کنکریاں برس تو تم نے نہیں ماریں بلکہ اللہ نے ماریں) دیکھو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رمی، کو اپنی رمی کے لیے سبب ظاہر اور پردہ بنایا گو اس موقع پر دو طرف سے کنکریاں پھینکی گئیں ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو کفار نے دیکھا

اور ایک خدا کی طرف سے جس کو وہ نہ دیکھ سکے، لیکن اس کے اثر کو انھوں نے محسوس کیا، اسی لیے آیت میں نفی اور اثبات دونوں ساتھ ساتھ آئے ہیں، بعینہ ہی صورت، واقعہ فیل میں بھی نظر آتی ہے، قریش سنگباری کے زور سے ابرہہ کی فوج کو کعبہ سے دفع کر رہے تھے، خداوند تعالیٰ نے اسی پردہ میں، ان پر آسمان سے سنگباری کر دی، چنانچہ جس طرح غزوہ بدر کی رمی کو اپنی طرف منسوب کیا (ولكن الله دفعه) اسی طرح یہاں بھی کفار کو کھانے کے بھس کی طرح بنا دینا، اپنی قوتِ قاہرہ کی طرف منسوب کیا (فجعلهم كعصف مأكول) ظاہر ہے کہ یہ عظیم الشان معجزہ ہے، کیونکہ قریش کے لیے ابرہہ کے لشکر گراں کو پارہ پارہ کر دینا تو دیکنا اس کو شکست دے دینا بھی آسان نہ تھا۔

چھٹا اعتراض

مولانا میرٹھی کا چھٹا اعتراض یہ ہے۔

”عربیت کا صحیح ذوق قطعاً یہ گوارا نہیں کرتا کہ ”ترمیمہ“ میں خطابِ سنگباری

کرنے والے اشخاص سے ہو، بریں تقدیر ”ترمیمہ“ لانا ضروری تھا، اور

اللہ تعالیٰ ترمیم کے بجائے ترمیم فرمانے سے عاجز نہ تھا“

مولانا فراہی کو عربی ادب کا ذوق تھا یا نہیں، اس سے یہاں بحث نہیں ہے۔ البتہ اس

قدر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ خود مولانا میرٹھی نے صحیح ذوق کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ قرآن

مجید کی یہ آیت ملاحظہ ہو۔

کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر

قادر ہے، کیا نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اور اللہ

کے سوا تمہارا کوئی یا وہ و ناصر نہیں۔

أَلَمْ تَعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ، أَلَمْ تَعْلَمَ أَنَّ

اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ

وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (بقرہ ۱۰۶، ۱۰۷)

مولانا فراہی کی تفسیر سورہ فیل

ان آیات میں خطاب صیغہ ”واحد“ ”الم تعلم“ سے شروع ہوا ہے اور دوبارہ پھر واحد ہی کا صیغہ ”الم تعلم“ استعمال ہوا ہے، اور اس کے بعد ”ما لکم“ میں جمع کی ضمیر آگئی ہے، عربی ادب کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کے دونوں واحد کے صیغوں میں مخاطب جماعت کا ایک ایک فرد علیحدہ علیحدہ مراد ہے، پھر اس کے بعد پوری جماعت کو جمع کے صیغہ سے خطاب کیا گیا، کیا یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ عربیت کے صحیح ذوق کے مطابق ”الم تعلم“ کے بجائے ”الم تعلموا“ ہونا چاہئے تھا، جیسا کہ ”المتر“ کے بارے میں مولانا میرٹھی صاحب نے فرمایا ہے۔
 راصل یہ طریقہ استعمال عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل خود مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں، مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں۔

”یہ زبان کا مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے، گویا واحد کا لفظ ایک ایک کر کے پوری جماعت کو مخاطب کرتا ہے، کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں تو رات میں جہاں کہیں خدا نے نبی اسرائیل کو واحد کے صیغہ سے خطاب کیا ہے، وہاں یہی اسلوب ملحوظ ہے، مفصل بحث ”کتاب الاسالیب“ میں ملے گی، یہاں ہم صرف قرآن مجید سے بعض مثالیں نقل کریں گے۔

فرمایا ہے :-

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اَظْلٰكَ تَجَرَّىٰ فِی الْبَعْرِ
 بِنِعْمَةِ اللّٰهِ لَیْرٰیكُم مِّنْ اٰیٰتِهٖ
 (تفان ۳۱)

نہیں دیکھتے کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ
 کے فضل سے تاکہ تم کو اپنی نشانوں کا شاہدہ
 کرائے۔

اس آیت میں کلام، واحد کے صیغہ (الحدس) سے شروع ہوا، لیکن پھر ”لیوید کحہ“ میں جمع کی ضمیر آگئی، کیونکہ واحد سے مقصود درحقیقت جمع ہی تھی۔
دوسری جگہ ہے۔

۱۔ یہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک موثر کتاب ہے، جس میں قرآن مجید کے بیشتر اسالیب اور ان کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب ”اسالیب القرآن“ کے نام سے چھپ چکی ہے اور دائرہ عقیدہ مدرسۃ الإصلاح سر اے ٹی میر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنَّ يَاسْتَكْبِرُ هَبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ
نہیں دیکھے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو ایک غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر وہ چاہے تو ہمیں فنا کر دے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق بسائے۔ (ابراہیم ۱۹)

اس آیت میں وہی اصول ملحوظ ہے، کبھی اس کے برعکس جمع سے کلام شروع ہوتا ہے اور پھر واحد کی ضمیر آجاتی ہے، لیکن اس سے مقصود وہی جمع ہوتی ہے، مثلاً
هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَثَلٍ شَرٍّ لِّالشَّيْطَانِ، تَنْزِلُ عَلَىٰ كُلِّ آفَاقٍ
میں نہیں بتاؤں کہ شیطان کن پر اترتے ہیں؟ وہ لپاٹیوں اور گنگناہوں پر اترتے ہیں، وہ کان لگاتے ہیں، حالانکہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور شعرا کی پیروی تو گمراہ لوگ کرتے ہیں
كَذِبُونَ، وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَكْفُرُونَ (شعرا: ۲۲۱-۲۲۵) نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں جھٹکتے پھرتے ہیں۔

کلام شروع ہوا (انبیاء) ضمیر خطاب جمع سے اور پھر ”الحدتہ“ واحد کا صیغہ آگیا۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ ”رمی“ کا لفظ ”طیر“ کے لیے عربی زبان اور کلام مجید میں کہیں اور بھی استعمال ہوا ہے؟ ہمارے محدود مطالعہ کی حد تک کلام عرب میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ ”طیر“ کے لیے ”رمی“ کا لفظ استعمال ہوا ہو، رمی کے معنی کسی چیز کو طاقت سے دور پھینکنے کے آتے ہیں چنانچہ لسان العرب میں ہے۔

قال البرد معناه مارمیت مبرد نے کہا کہ ”مارمیت اذ رمیت“ کا بقوتك اذ رمیت و لكن بقوة معنی یہ ہے کہ تم نے اپنی قوت سے کنکری نہیں پھینکی بلکہ اللہ کی قوت سے پھینکی۔

ظاہر ہے کہ رمی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی جو بیج اور چنگل سے نہیں ہو سکتی، دھچپ بات یہ ہے کہ جن روایتوں میں اس کا ذکر ہے کہ چڑیوں کے جو بیج اور چنگل میں چنے کی دال کے برابر

۱۳-۱۴ (از مولانا فرامی) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فرامی کی اس ایبل القرآن

۳۳۵ لسان العرب ج ۴ م

سنگریزے تھے، خود ان میں بھی ان کے کنکریاں پھینکنے کے لیے ”رمی“ کے بجائے ”القت“ اور ”ارسلت“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور ”رمت“ کا لفظ انہیں استعمال ہوا، خود بہت سے قدیم مفسرین کو بھی یہ لفظ ٹھکا ہے، چنانچہ انہوں نے اس کی عجیب و غریب تاویل کی ہے کہ چڑیاں مڑ کر اور عجیب ڈھنگ سے اپنے چونچ اور جھگل کو گھوما کر دانوں کے برابر سنگریزے گراتی تھیں، پس عربیت کا ذوق اس سے قطعاً باکرتا ہے کہ چڑیوں کے لیے ”رمی“ کا لفظ استعمال ہوا اور ”ترمی“ کا فاعل انہیں مانا جائے۔

ساتواں اعتراض

اب مولانا میرٹھی کا ساتواں اعتراض ملاحظہ ہو۔

”مولانا فراہیؒ نے ابرہہ کے لشکر کا بے مثال شجاعانہ دفاع کرنے کا متعہ اہل مکہ کے علاوہ ان حاجیوں کو بھی عطا فرمادیا ہے، جو اس سال حج کے لیے آئے تھے، حالانکہ اس وقت مکہ میں باہر سے آئے ہوئے کسی حاجی کے رہنے کی بات باور کرنے کے لائق نہیں ہے، باہر سے آئے ہوئے حاجی تو تیرہویں چودھویں ذی الحجہ کو اپنے وطن کو واپس ہو جاتے تھے، اور ابرہہ کا لشکر ماہ محرم میں وادی محسر پہنچا تھا۔“

مولانا کے اس اعتراض کا وزن اس وقت تسلیم کیا جاسکتا ہے جب قطعی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ واقعہ فیل ماہ محرم ہی میں پیش آیا تھا، جبکہ اس سلسلہ میں متعدد اقوال منقول ہیں ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چالیس روز قبل یہ واقعہ پیش آیا ایک قول پچاس روز قبل کا ہے ان کے علاوہ پندرہ سال قبل، دس سال قبل، تیس سال قبل، تیس سال قبل یہاں تک کہ چالیس سال اور ستر سال قبل ولادت تک کے اقوال موجود ہیں۔ انہی میں سے ایک کو ترجیح دے کر مولانا فراہیؒ نے بڑے وثوق و اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ”علمائے سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کا حملہ موسم حج میں پیش آیا تھا۔“ گو اس موقع پر انہوں نے اس کے لیے کوئی حوالہ

۱۔ تدریقرآن ج ۸ ص ۱۵۰ (از مولانا امین احسن صاحب اہل حجاز) ۲۔ دیکھئے روح المعانی جز ۳ ص ۲۲۳
تفسیر خازن ج ۷ ص ۲۲۵، بغوی کی معالم التنزیل پر حاشیہ خازن طبع مصر ۱۳۳۲ھ اور الدر المنثور ج ۶ ص ۳۹۵ وغیرہ
۳۔ تفسیر سورہ فیل ص ۵۲ ۱۹۳۷ء

نہیں دیا ہے، مگر ان سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کوئی بے سرو یا اور بے بنیاد بات لکھیں گے، ممکن ہے مولانا کے ذہن میں حوالہ موجود رہا ہو لیکن اپنی یادداشت پر اعتماد کے سبب اس کو درج نہ کر سکے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا نے مختلف اقوال و قرآن سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو کہ واقعہ فیل جج کے موسم میں پیش آیا تھا، جیسا کہ خود اہل عرب کے بیانات سے اس کا اشارہ ملتا ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تاریخ و سیر کی کتابوں میں تلاش و جستجو کے باوجود سر دست ہمیں مولانا فراری کے اس قول کا کوئی حوالہ تو دستیاب نہیں ہو سکا، مگر جن لوگوں نے واقعہ فیل کا زمانہ، ماہ محرم، بتایا ہے ان کا اخذ صرف محمد بن اسحاق کی بیان کردہ روایات ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے اہم اور عظیم الشان واقعہ کے ثبوت کے لیے تنہا ایک شخص کی روایات کافی نہیں ہو سکتیں، وہ بھی ایسے شخص کی جس کی بہت سے اہل فن نے تضعیف بھی کی ہو، چنانچہ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ محمد بن اسحاق کے بارہ میں تہذیب التہذیب جلد ۹ میں لکھتے ہیں:-

۱۔ وقال مالك، دجال من الدجال جلد (ص ۱۱) امام مالک نے فرمایا کہ (محمد بن اسحاق) دجالوں میں سے ایک دجال ہے۔

۲۔ وقال البخاری، ایضا محمد بن اسحاق نیبغی ان یكون له الف حدیث ینفرد بها (ص ۲۱) اور امام بخاری نے فرمایا کہ محمد بن اسحاق تقریباً ایک ہزار احادیث میں منفرد ہیں

۳۔ وقال یعقوب بن شعبہ سمعت ابن نمیر یقول..... وانما اتی انه یحدث عن المجهولين احادیث باطله (ص ۲۲) یعقوب بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن نمیر سے سنا، وہ کہتے تھے کہ..... محمد بن اسحاق مجہول لوگوں سے باطل اور بے بنیاد روایتیں بیان کرتے ہیں۔

۴۔ وقال احمد بن حنبل کان محمد بن اسحاق یدلس (ص ۲۳) امام محمد نے فرمایا کہ محمد بن اسحاق تدلیس کیا کرتے تھے۔

۵۔ وقال عباس الدوري عن ابن معین محمد بن اسحاق ثقة (ص ۲۴) عباس دوری ابن معین سے نقل کرتے ہیں کہ محمد بن اسحاق ثقہ تو ہیں مگر حجت نہیں۔

ولیس بحجة (ص ۲۴)

۶۔ وقال ابن المديني ثقة لم يضعه عندی الا روايته عن اهل الكتب له
ابن مديني نے کہا کہ محمد بن اسحاق میں تو ثقہ
مگر میرے نزدیک ان کا کوئی دجہ نہیں ہے
اس لیے کہ وہ اہل کتاب سے روایتیں
لیتے ہیں۔ (ص ۴۵)

یہی وجہ ہے کہ محتاط علماء و مفسرین اور ارباب سیر و تاریخ اس مسئلہ میں بالکل خاموش
ہیں اور جن لوگوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے، تو انہوں نے ہینہ کی کوئی صراحت نہیں کی ہے، مثلاً
امام فخر الدین رازی وغیرہ لکھتے ہیں۔

لم یکن بین عام الفیل ومبعث الرسول الا نيف واربعون سنه
عام الفیل اور بعثت رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کے مابین چالیس سال اور کچھ ہینہ کا وقفہ تھا۔
اس کے مقابلہ میں مولانا فراہی کے خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عکرمہ بن ہاشم بن عبد
مناف نے صراحتاً اپنے شعر میں یہ کہا ہے کہ ابرہہ کے آدمی قربانی کے کچھ اونٹ بھی نہ کالے گئے تھے
چنانچہ وہ کہتا ہے۔

لاهم اخرا الاسود بن مقصود
الخذ الهجمة فيها التقليد
خداوند! اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جبکی گردنوں میں قلاوے تھے نہ کالے گئے،
بہن حراء و شبیر فالسید
يحبسها وهي اولات التطريد
حرا شبیر اور بید کے درمیان ان کو روکا اور وہ نہ کالے جانے کے لیے تھے۔
فضتها إلى طماطم سود
اخضر يا رب وانت محمود له
پھر ان کو جشی غلاموں کے حوالہ کیا، خداوند! ان کو اپنی ماں سے محروم کر دے، تو سزاوارحہ ہے
ابن جریر طبری اور بعض دوسرے مورخین کے بیان میں بھی یہ صراحت ملتی ہے:

۷۔ ہم نے یہ چند اقوال اس لیے نقل کر دیے ہیں تاکہ یہ ذہن میں رہے کہ واقعہ فیل میں چڑیوں کے پتھر
مارنے کی تمام روایتیں انہی محمد بن اسحاق کی بیان کردہ ہیں اور ان سے پہلے کسی راوی کا پتہ نہیں، ویسے اس کتب میں
ان کے غیر متبرہ ہونے کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں اور ساتھ ہی ان کی ثقاہت کے بھی بہت سے اقوال موجود ہیں
مگر امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث انہیں بالکل ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں۔

۸۔ تفسیر الفخر الرازی ج ۳۲ ص ۹۷
۹۔ تفسیر سورہ فیل ص ۵۲
۱۰۔ ۱۹۳۷ء

ولما نزل ابرهة المغمس وھمت قریش وکنانة
اور جب ابرہہ وادی مفس میں خیمہ زن ہوا...
ومن کان معہم بالحرم من لوگ جو اس وقت ان کے ساتھ حرم میں
سائر الناس بقتالہ لہ موجود تھے سب نے ابرہہ سے مقابلہ کی
ٹھان لی۔

روایت کے الفاظ ”ومن کان معہم بالحرم من سائر الناس“ خاص طور پر غور طلب ہیں، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق دس بیس آدمیوں کے بجائے ایک جم غفیر ہی پر ہو سکتا ہے، اگر یہ واقعہ ماہ محرم کا ہے جب کہ موسم حج ختم ہو چکا تھا اور مکہ اور اس کے قریب بازار، عکاظ اور ذی الحجۃ وغیرہ بھی بند ہو گئے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ اس وقت حرم میں آگئے تھے؟ ظاہر سی بات ہے کہ یہ حجاج کرام ہی ہو سکتے تھے دوسرے نہیں، ورنہ پھر ”من سائر الناس“ کا کیا مطلب ہوگا؟

ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے، سورہ فیل میں ہے ”الھ یجعل کیدھم فی تضلیل یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی مخفی چالوں کو ناکام بنادیا، اب یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مخفی چال کیا تھی؟ اس کا جواب مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

”قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب فیل نے ایک مخفی تدبیر (کید) کی تھی، لیکن روایات میں اس کے حملہ کے جو وجوہ بیان کیے گئے ہیں، ان میں مخفی تدبیر کا کوئی پہلو نہیں ہے، وہ قوت کی نالائش اور عرب کی تذلیل کی ایک کھلی ہوئی کاروائی ہے، البتہ قابل اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی تدبیر) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں، مثلاً

۱۔ اس نے اشہر حرم میں حملہ کیا، کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ و خونریزی سے احتراز کرتے۔

۲۔ تفسیر ابن جریر ج ۳۰ ص ۲۰۱ دیکھئے اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی عام کتابوں میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں مولانا فراہیؒ نے ان پر اعتماد نہیں کیا ہے، بلکہ دوسری روایتوں پر اعتماد کیا ہے، اور وہیں سے یہ بات لی ہے کہ واقعہ فیل موسم حج میں پیش آیا تھا، تحقیق کے بعد اگر اس ماخذ کا پتہ چل گیا تو انشاء اللہ ہم اس پر الگ سے لکھیں گے۔

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج میں ہوتے ہیں۔

۳۔ اس نے خاص طور پر ایام تشریق میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں مقیم ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آرہے ہوں گے۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اب غور کرو کہ خداوند تعالیٰ نے ان کی چالوں کو کس طرح برباد کر دیا۔

۱۔ ان کی فوج کو لجن محسر ہی میں روک دیا۔

۲۔ محسر کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا۔

۳۔ خدا نے آسمان سے سنگریزے برسانے والی آندھی بھیجی۔

ان تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعہ فیل کا موسم حج میں بیش آنا زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ اس سے زیادہ بہتر اور موزوں توجیہ کوئی اور نہیں بتی ہے، مولانا میرٹھی صاحب کی نظر کید کے نکتہ کی جانب نہیں گئی، اس لیے انھوں نے اس کی مراد سے کوئی بحث نہیں کی، چنانچہ ان کی بیان کردہ تفصیلات میں اس مخفی تدبیر کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا، مولانا نے ”کید“ کا ترجمہ ”منصوبہ“ کیا ہے، اس کے باوجود ہمارا سوال اپنی جگہ برقرار ہے، کیونکہ منصوبہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے، ایک پوشیدہ اور ایک ظاہر، اور جب اس کے لیے ”کید“ استعمال کیا جائے گا تو اس سے پوشیدہ منصوبہ ہی مراد ہوگا، نہ کہ ظاہر۔

آٹھواں اعتراض

مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی اپنے آٹھویں اعتراض کے تحت تحریر فرماتے ہیں:-
 ”مولانا فراہیؒ نے سنا ہے کہ جاہلیت کے شعراء و خطباء کے کلام کا بڑا گہرا مطالعہ فرمایا تھا، اور عربی زبان سے کما حقہ واقفیت کے لیے اس کا مطالعہ بلاشبہ نہایت مفید ہے، لیکن اس مطالعہ کی وجہ سے مولانا کے ذہن میں جاہلیت کے عربوں کی جو اخلاقی تصویر مرتب ہو گئی تھی وہ صحیح نہ تھی، مولانا فراہیؒ کے گمان میں عام اہل عرب شجاعت، سخاوت، خودداری و عزت نفس میں دگر مالک کے باشندوں سے فائق و ممتاز تھے، یہ سراسر غلط ہے، کسی قبیلہ میں اکا دکا اشخاص ایسے بلند اخلاق

ہوں تو ہوں، عام اہل عرب کے نہ تھے، وہ بہادر تھے آپس میں قتل و غارت کرنے کے لیے، لیکن عجمی اقوام یعنی ایرانیوں اور رومیوں، جشیوں اور مصریوں سے ایسے ہی مرعوب تھے جیسے انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے باشندے انگریزوں سے مرعوب رہا کرتے تھے، وہ حد درجہ لاپچی اور کجخوس تھے، اپنے یمیوں پر بھی انھیں رحم نہیں آتا تھا، دگر مسکینوں کا ذکر ہی کیا، ان کے شعراء نہایت جھوٹے ہوتے تھے..... پس یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اہل مکہ نے ابرہہ کے لشکر پر سنگباری کرنے کی جرأت کی تھی۔“

ہیں پھر افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ مولانا میرٹھی کا یہ اعتراض بھی عربوں کی صحیح عادات و خصائل سے بالکل عدم واقفیت کا نتیجہ ہے یا پھر مولانا اپنے مخصوص نظریات کی تائید و حمایت میں جاہلی عربوں سے متعلق تاریخی حقائق اور واقعات سے بالارادہ چشم پوشی کر رہے ہیں۔ جاہلی عربوں کی جو تاریخ محفوظ ہے اس کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ”قریش اور بنو اسماعیل کا تمام تر سرمایہ فروناز ہمیشہ شہسواری، شیرزنی، قد راندازی اور فیاضی و مہمان نوازی رہی ہے، یہاں تک کہ غیروں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر آنچ نہ آنے دی“ ان کے اس مسلم شرف کو معقول دلیل و شہادت کے بغیر نہ ماننا، ان کو گیدڑوں سے تشبیہ دینا اور حد درجہ لاپچی اور کجخوس بتانا بڑی جرأت کی بات ہے، ہم مولانا کے اس اعتراض کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ یہ سراسر غلط ہے کہ عام اہل عرب شجاعت، سخاوت، خودداری و عزت نفس میں دیگر ممالک کے باشندوں سے فائق تھے، وہ رومیوں، ایرانیوں وغیرہ سے ایسے ہی مرعوب تھے جیسے انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے باشندے انگریزوں سے مرعوب تھے۔

۲۔ وہ حد درجہ لاپچی اور کجخوس تھے، اپنے یمیوں پر بھی انھیں رحم نہ آتا تھا۔

۳۔ ان کے شعراء نہایت جھوٹے ہوتے تھے (مولانا میرٹھی)

ان میں سے ہر دعویٰ کے بالمقابل ہم علماء، محققین اور نامور مورخین کی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم مشہور مستشرق عالم ڈاکٹر گستاویلیان کی شہرہ آفاق کتاب ”تمدن عرب“ سے دو اقتباسات نقل کرتے ہیں، جو علی الترتیب پہلے اور دوسرے اعتراضات کو رد کرنے اور عربوں کے اصل روپ کو سامنے لانے کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ ”یونانی جو تھی صدی قبل مسیح سے بھی پہلے سے عربستان سے واقف تھے، اور اس ملک کی دولت نے اسکندر کو اس کے فتح کرنے پر آمادہ کیا، نیا رسل نے جزیرہ نمائے عرب کے گرد جو بحری فوج کشی کی اس کا نتیجہ عنقریب ظاہر ہونے والا تھا، لیکن اسکندر کی وفات نے اسے روک دیا،..... لیکن جس وقت اینٹلوں شام اور قینیہ پر قابض ہو گیا، اس نے اپنے ایک سربراہ کو وہ سپہ سالار کو بطیوس کے مقابلہ میں بھیجا، یہ سپہ سالار حملہ ناگہانی کر کے پٹرا پر قابض ہو گیا، لیکن اس کی ساری فوج جس کی تعداد چار ہزار چھ سو تھی بالکل برباد ہو گئی، اس کے بعد اینٹلوں نے اپنے بیٹے ڈیٹرکس کو ان کے مقابلہ میں بھیجا، ہر دو طرف لکھتا ہے کہ جس وقت ڈیٹرکس پٹرا میں پہنچا تو عربوں نے اس سے یہ کہا ”اے شاہ ڈیٹرکس تو ہم سے کیوں لڑتا ہے، ہم ایک ایسے بیابان کے رہنے والے ہیں جہاں شہر والوں کو ماہیتاج طلق نہیں مل سکتیں، ہم نے ایک اس قسم کے بے پیداوار ملک میں رہنا اسی وجہ سے اختیار کیا ہے کہ ہم ہرگز غلام بننا نہیں چاہتے..... اگر تو محاصرہ کو طول دینا چاہتا ہے تو بہت جلد تجھے ہر قسم کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، اور تو ہرگز ہمیں مجبور نہیں کر سکے گا،..... ڈیٹرکس نے اس صلح کے پیغام کو غنیمت جانا اور خوشی خوشی تحائف لے کر ایک ایسی لڑائی کو ختم کر دیا جس میں اسے سخت مشکلات معلوم ہو رہی تھیں.....“

ان کی (عربوں) لوٹ مار اور ان کی چڑھائیوں پر روم کے شاہنشاہوں کو جن کا ملک دریائے فرات تک پہنچ گیا تھا، سخت غصہ آیا اور انھوں نے ان کی گوشمالی کے لیے عربستان کو ہستانی پرکشی لشکر کشیاں کیں، لیکن اس کا نتیجہ اسی قدر ہوا کہ یا تو چند روزہ خراج وصول ہوا یا چند روز کے لیے جنگ و جدل موقوف ہو گئی، یہ بدوی اقوام اس وقت بھی اسی طرح جنگ کرتی تھیں جیسے اب کرتی ہیں۔“

شاہنشاہ اگسٹس نے اس دولت کی لالچ میں جو سا لہا سال سے یونانی

۱۸۷
۱۔ یہ سکندر کا سپہ سالار تھا، ۲۔ یہ بھی سکندر کے سپہ سالاروں میں تھا اور شام اور قینیہ کا ملک اس کو ملا تھا۔
۳۔ اگسٹس سب سے پہلا شاہنشاہ روم تھا، اس کے وقت میں روم کی سلطنت جمہوری کا خاتمہ ہوا۔“

اور آدمی موحین کے متخیلوں میں بھری ہوئی تھی، ایک چڑھائی یمن پر کی، لیکن یہ مطلق سرسبز نہ ہوئی اور شاہنشاہ ٹائی بیرس کے زمانہ میں البتہ اتنا ہوا کہ عربستان کا ایک چھوٹا سا گوشہ جہاں اکثر بدوی اقوام رہتی تھیں، چند روز کے لیے فتح ہو گیا۔
جس وقت رومیوں کا دار السلطنت قسطنطنیہ میں آیا، اس وقت عربوں نے دریائے فرات کی حکومت کے لیے ایرانیوں اور یونانیوں کا مقابلہ کیا۔

اس مختصر کیفیت سے ثابت ہوتا ہے کہ باستثنائے سرحدات شمالی عربستان بالکل غیر اقوام کی فتوحات سے محفوظ رہا۔ وہ بڑے بڑے مصری، یونانی، رومی اور ایرانی وغیرہ ملک گیر جنھوں نے تمام دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا، عربستان کا کچھ بھی نہ کر سکے اور اس عظیم الشان جزیرہ نما کا دروازہ مطلق بند رہا..... کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں عربستان ہی کا ملک ہے جس کا بڑا حصہ غیر اقوام کی حکومت سے بچا رہا ہے۔“

۲۔ ”دیورثرے لکھتا ہے کہ عربوں کے خصائص میں شاید وہ خاصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے جو لوٹنے کے ولولہ اور مہمان نوازی کے جوش سے مل کر پیدا ہوئی ہے، غارت گری کا اشتیاق اور اس کے ساتھ فیاضی، شدید بے رحمی اور کپر کشادہ دلی، وہ خاصیتیں ہیں جو ان کے اوصاف اصدا کو ہمارے سامنے لاتی ہیں اور ایک ہی تقریر میں ایک ہی شخص کی نسبت میں مرتبہ ہم سے آفریں اور نفریں کہلاتی ہیں..... ہمیں ایسے خصائص قبیہ کے ساتھ ہرگز بہرہ ردی نہ ہوتی اگر انہی کے مقابل میں اعلیٰ درجے کے اوصاف بھی نہ ہوتے، وہی مرد کا رزار جس کے ہاتھ سے لوٹ کے اشتیاق یا غیرت کے جوش میں شدید سے شدید بے رحمی کے افعال سرزد ہوتے ہیں، جس وقت اپنے خیمہ میں بیٹھتا ہے تو ایک مہربان مینبان بن جاتا ہے، اور اعلیٰ تواضع سے پیش آتا ہے جو کوئی مصیبت زدہ ان کی

== اور بادشاہت قائم ہوئی، سال ولادت ۳۲۰ ق م اور سال وفات ۳۷۰ ع ہے۔

۳۔ ٹائی بیرس دوسرا شاہنشاہ روم اور آگسٹس کا بیٹا تھا۔ سال ولادت ۳۰ ق م سال وفات ۳۸ ع ہے۔

۴۔ تمدن عرب ص ۸۳-۸۴ مطبوعہ اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء

پناہ میں آگیا، جس نے ان حمیت پر بھروسہ کیا، تو پھر اس کی مدارات دوستوں کی سی نہیں ہوتی بلکہ عزیزوں اور قرابت داروں کی سی، اس مہمان کی جان مقدس و محترم ہو جاتی ہے اور مہربان کو اس کی حفاظت خود اپنی جان پر کھیل کر بھی واجبات سے ہوتی ہے، اگرچہ اس پر یہ کیوں نہ ثابت ہو جائے کہ جو شخص اس کی پناہ میں بیٹھا ہے، یہ وہ دشمن جانی ہے جس کی تباہی کی وہ سوبارا زد کر چکا ہے، اسے شاید اس میں بھی تا مل نہ ہوگا کہ اسم مہمانداری کو عمدہ طور پر اور کشادہ دلی سے ادا کرنے کے لیے اپنے ہمسایہ کا اونٹ بزور پھین لائے یا حسن تقریر سے فانگ لائے۔

ان دونوں بیانات کو پیش نظر رکھ کر مولانا کے دونوں الزامات کا جائزہ لیجئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کیا مولانا کا بیان صحیح ہے یا ان موضوعین کا اعتراف حقیقت، جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ عربوں، مسلمانوں اور اسلام کی ایسی تصویر کشی کریں کہ ساری دنیا ان سے متفرق ہو جائے اور انھیں حقیر، ذلیل اور رسوا سمجھنے لگے؟ غیروں کے یہ دونوں اقتباسات نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ورنہ تاریخ عرب کی تمام کتابیں عربوں کی غیرت و حمیت، عزت و خود داری، حلم و بردباری، بہمت و دلیری، شجاعت و بہادری، شہسواری و شمشیر زنی اور حریت پسندی نیز ان کی فیاضی و مہمان نوازی، پڑوسیوں کی حفاظت اور غریبوں اور مسکینوں کی اعانت کے تذکرے سے بھری پڑی ہیں۔

۲۔ اب ڈاکٹر یحییٰ جبوری استاذ جامعہ قطر کی اہم تصنیف ”الشعر الجاہلی“ کی ایک عبارت کا ترجمہ

پیش کیا جا رہا ہے۔

اشعار کو عربوں کے یہاں بڑی اہمیت حاصل تھی، کیونکہ یہ عربوں کے مفخر، آثار اور ان کے اوصاف میں شامل تھے، اشعار صاحب کلام کی نفسیات، مناقب، بہادری، دلیری، جنگجوئی، غم و غصہ، خوشی و مسرت، جود و سخا اور عدل و وفا جیسے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ابھی بری عادتوں کو واضح کرتے ہیں، یہ اشعار صاحب کلام کی زندگی اور ان کے گرد و پیش کے واقعات، حادثات اور ان کے حسب و نسب کو محفوظ رکھتے ہیں، اسی بنا پر اشعار عرب کو ”عربوں کا دیوان“ (تاریخ) کہا جاتا ہے، ابو الہلال عسکری کہتے ہیں ”عربوں کے حسب و نسب اور ان کی زندگی کے مختلف

ادوار اور واقعات کی معرفت انہی اشعار سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے یہ عربوں کا دیوان (تاریخ) ان کی حکمت کا مخزن اور ان کے علم و ادب کا گنجینہ ہیں، جب کبھی وہ عزت و رفعت اور نصرت و ظفر مندی سے ہمکنار ہوتے یا کوئی اہم واقعہ پیش آتا تو فوراً اسے اپنے قصیدہ میں نظم کر لیتے تھے، کہ قصیدہ ہی ان کے نزدیک سب سے زیادہ دیر پا اور محفوظ رہنے والی چیز تھی، ان کے نزدیک اپنے کارناموں کو محفوظ رکھنے کا یہی طریقہ تھا،^۱ جاحظ کی کتاب ایحیوان میں ہے ”دنیا کی ہر قوم اپنے اثر و محاسن اور کارناموں کی بقا اور حفاظت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اختیار کرتی ہے، دور جاہلیت کے عرب اپنے کارناموں کی حفاظت کے لیے موزوں کلام پر اعتماد کرتے تھے، چنانچہ ان کا کلام ہی ان کا دیوان ہے،^۲ ابن عبدالسلام کا بھی یہی خیال ہے کہ ”شعری دور جاہلیت کا دیوان، ان کے علم و حکمت کا منتہی اور ان کی معلومات کا خزانہ تھا، اور جب باہم مفاخرت کا موقع آتا تھا تو اسی کی طرف مراجعت کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرماں ہے کہ ”شعر ایک ایسی قوم کا علم ہے جس کے یہاں اس سے زیادہ صحیح کوئی دوسرا علم نہیں تھا“^۳

یہیں اشعار جاہلیت کے متعلق علماء و ادباء کے بیانات اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان اب آپ خود مولانا شبیر احمد صاحب کے اس دعویٰ کی صداقت کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ”ان کے شعرا نہایت بھوٹے ہوتے تھے“^۴

۱۔ کتب الصنائع ۱۳ ص ۱۲۵ کتاب ایحیوان ۱/۷۱-۷۲ ۲۔ طبقات الشعراء ص ۲۲

۳۔ ان بیانات کے نقل کرنے سے ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ عربوں کے اندر کوئی برائی تھی ہی نہیں بلاشبہ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے اندر بہت سی خراب قسم کی خصائص بھی پائی جاتی تھیں، جنہیں اسلام نے اگر دوکھا اور پھر اپنی برکت اور ان کے جوہر ذاتی کی بدولت ان سے دنیا کی سیادت و قیادت اور حق کی رہنمائی کا کام لیا، فطرت کی اسی صحیحیت اور ذاتی ذہانت و قابلیت کی بنیاد پر ہی دنیا کی تمام متمدن اقوام کے بالمقابل انھیں عربوں کو اسلام جیسی عظیم تحریک کی امانت سونپی گئی، اس لیے کہ وہی دراصل اس کے اہل تھے، عربوں کے محاسن و مثالب کا اگر طالب علمانہ طور پر فکر و نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت نہایت واضح طور پر معلوم ہو جائے گی کہ ان کے معائب کا بڑا حصہ درحقیقت ان کو صحیح تربیت نہ ملنے کی وجہ سے تھا، اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ اگر کسی صحاح اور

نواں اعتراض

مولانا میرٹھی اپنے آخری اعتراض کے تحت رقمطراز ہیں۔
 ”اگر اہل مکہ نے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہوتا تو شعرائے قریش نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس کا ذکر کرتے، اور قریش کی شجاعت و بسالت کا اپنے قصیدوں میں وہ صورتیں نکلتے کہ ان پر ہی آواز سنائی نہ دیتی، حالانکہ اس دور کے کسی بھی قریشی یا غیر قریشی شاعر نے لشکرِ ابرہہ کی تباہی کو انسانی شجاعت کا ثمرہ نہیں بتایا، جس شاعر نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔“

یہ صحیح ہے کہ شعرائے قریش نے فخر و مباہات کے طور پر لشکرِ ابرہہ سے اپنی معرکہ آرائی کا بہت زیادہ ذکر نہیں کیا ہے، لیکن اس کے علاوہ عین وقت پر غول درغول چڑیوں کا نمودار ہونا اور مخصوص جہاں پر ہی پتھر مارنا اور ان کو کھانے ہوئے بھس کی طرح بنا دینا بھی کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، مگر عرب شعرائے اس کا بھی تو ذکر نہیں کیا ہے، اگر ابرہہ کا لشکر چڑیوں کی سنگ باری سے تباہ ہوا ہوتا، تو عرب شعرا جہاں اس واقعہ کو محض اللہ کی آیت و قدرت اور اس کی غیبی مدد کے طور پر ذکر کرتے ہیں، وہیں چڑیوں کے اس عجیب و غریب اور غیر متوقع عمل کا بھی ذکر ضرور کرتے، مگر ایسا نہیں ہے مولانا میرٹھی صاحب نے جو اشعار نقل کیے ہیں یا جو دوسری کتابوں میں مذکور ہیں، ان میں شعرائے چڑیوں اور پتھروں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن یہ کہیں نہیں ہے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے، بلکہ انھوں نے اس سنگ باری کو ”حاصب اور ساف“ کا نتیجہ قرار دیا ہے، چنانچہ البوقیس کہتا ہے۔

فارس من ربه حاصب يلضهم مثل لفت القزم

پھر اللہ کی طرف سے ان پر ”حاصب“ چلی جو خس و خاشاک کی طرح ان کو لپیٹ لیتی تھی

البوقیس بن اسدلت یثربی کہتا ہے۔

فلما اجاز والطن نعمان ردھم جنود الاله بین ساف وحاصب

= زرخیز زمین کا کوئی ہوشیار مانی نہ ہو جو اس کی دیکھ بھال کرتا رہے، تو اس میں گل و لالہ کے ساتھ بگلے پونے بھی بہت آگے آتے ہیں۔ ۱۵ تفسیر ابن کثیر میں ہے فجاءت حتی صفت علی رؤسهم رج م صاھہ، اسی طرح کے الفاظ اور المعانی میں بھی ہیں۔ ۱۶ ”حاصب“ کا لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے، مفسرین نے اس کے معنی ایسی تندہوا کے لیے =

جو نبی وہ بطن نمان سے آگے بڑھے، خدا کی فوجوں نے ”ساف“ اور ”حاصب“ کے درمیان نمودار ہو کر ان کو پسپا کر دیا۔

ان اشعار میں چڑیلوں کی سنگباری کو نہ بیان کرنے کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ عربوں نے اپنی معرکہ آرائی کا بالکل ہی ذکر نہیں کیا ہے، دراصل ابرہہ کے ساتھ ان کے معرکہ آرائیوں کا ہر جگہ چرچا تھا، بعض شعرا نے اس پر فخریہ اشعار بھی کہے ہیں۔ غالباً مولانا ان سے ناواقف ہیں اسی وجہ سے انھوں نے ایک بے بنیاد دعویٰ کر ڈالا، قدیم اسلامی شاعر ذوالترمذی کہتا ہے۔

وابرہۃ اصطادت صدور صاحبنا جہاراً وعشون العجاجة اكلد

اور ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا۔

تنجی لہ عمرو فشک ضلوعہ نبا فذۃ بخلہ والخیل تبصر لہ

عمر نے اس کی طرف پلک کر نیسے کے کاری زخم سے اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم تھے

دیکھئے ان شعروں میں صراحت ہے کہ اس کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ بھی مارا اور یہ واقعہ جس دن پیش آیا اس دن فضا نہایت غبار آلود تھی اور تاحد نظر آسمان تک غباری غبار دکھائی دیتا تھا تاہم اس واقعہ کا بہت نیلہ ذکر اس لیے نہیں کہ دراصل ان کی سنگباری کے پردہ میں سخت آندھی اور طوفان کے ذریعہ ایسی شدید خدائی سنگباری ہوئی کہ وہ جگانے پر مجبور ہو گئے اور جو نہ جھاگ سکے وہ وہیں چبائے ہوئے بھس کی طرح ہو گئے، یہ خدا کی قدرت کاملہ کا ایک عظیم الشان معجزہ تھا، وہ قریش کے لیے ابرہہ کے لشکر جبار کو پارہ پارہ کر دینا تو درکنار اس کو شکست دے دینا بھی آسان نہ تھا، اس لیے شعرائے عرب نے اس واقعہ کو محض اللہ کی آیت و قدرت اور اس کی غیبی مدد کے طور پر ہی ذکر کیا ہے، یہ عربوں کی بلند ظرفی، ان کے اعلیٰ اخلاق اور حقیقت پسندی کی وہ کھلی ہوئی دلیل ہے جس کی بلا ثبوت مولانا تردید کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو ہم مولانا فراہی کی تفسیر سے ان اسباب کو بھی بیان کرتے جن کے باعث لوگوں کو ”توسیعہ بجارۃ من سجیل“ کی تفسیر میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، اور انھوں نے اس کی تاویل میں ان روایتوں پر اعتماد کر لیا جو بقول مولانا فراہی ”یک قلم بے بنیاد ہیں، از روئے سندان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں، یہ تمام روایات ابن اسحاق تک منتهی ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ یہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔“ واللہ اعلم بالصواب۔

= یہ جو رد و مذمت کی وجہ سے زین ککریاں اور گریزے اٹھاتی ہیں اور فقط ساف ”توجڑیلوں کے لیے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا“ ساف“ اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد غبار، خس و خاشاک اور دھنوں کی خشک پتیاں اٹاتی ہوئی چلتی ہے۔

سلہ تفسیر سورہ فیل (مولانا فراہی) ص ۵۷ ۵۸ ایضاً ص ۵۹